اسلام اور قومیت

خُرّم مُرادؔ

منشورات

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : اسلام اور قومیت

مصنف : خرم مراد

طبع اول : جون ۲۰۰۹ء

تعداد : ۲۰۰۰

کوڈ : 00137

ناشر منشورات

E-8، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ 54790

042-35252210 - 35252211

042-35252194

SMS ur Address:
0332-003 4909, 0320-543 4909

manshurat@gmail.com / @hotmail.com

www.facebook/manshurat

www.pinterest.com/manshurat

مطبع : قومی پریس، ۵۰ لوئر مال، لاہور۔

قیمت : ۱۰ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قومیت کا مسئلہ ملت کا بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ ملکی سیاست میں اس کی گونج ایک عرصے سے سنی جارہی ہے۔ اس ضمن میں حالیہ برسوں کے دوران کراچی کے لسانی فسادات نے تو ہلا کر رکھ دیا جن میں ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کا خون بہایا، اُس کی عزت وآبرو پر ہاتھ ڈالا، اُس کے مال ودولت کو لوٹا اور ایک دوسرے کے ساتھ بدترین دشمنی کا مظاہرہ کیا۔ اس سے پہلے ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش میں ہونے والے فسادات میں مسلمانوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا، عزت وآبرو پر حملے کیے، اور بدترین سفاکیت اور درندگی کے مظاہرے کیے۔ یہ ساری چیزیں اسی مسئلہ قومیت کا شاخسانہ ہیں جو ہماری ملت اور قوم کی زندگی کا بڑا سنگین مسئلہ ہے۔

ہم تاریخ کے اوراق مزید پلٹیں تو دکھائی دیتا ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر اسی قومیت کے فلسفے نے خلافتِ عثمانیہ کے انہدام میں بڑا اہم کردار ادا کیا، جب عربوں کو عرب قوم پرستی کے نام پر ترک حکومت کے خلاف کھڑا کیا گیا۔ ان دونوں کی کش مکش کے نتیجے میں دمشق، بغداد اور حجاز میں پھر وہی مناظر دیکھنے میں آئے کہ مسلمان نے مسلمان کا خون بھی بہایا، اور ایک دوسرے کی عزت وآبرو اور مال ودولت پر بھی ہاتھ ڈالا اور اُس کو برباد کیا۔

مسلمان اس لحاظ سے دنیا کے اندر بڑے ممتاز ہیں کہ نسل، رنگ اور جغرافیے کے اختلاف کے باوجود، انھوں نے یک جائی، اخوت اور محبت سے زندگی کی شاہراہ پر قدم بڑھائے اور کبھی رنگ ونسل کو نفرتوں کا ذریعہ نہیں بنایا۔ مذکورہ واقعات کے باوجود آج بھی مسلمان قوم دنیا کی

بہت ساری قوموں کے مقابلے میں محبت اور اخوت کے رشتے میں پروئے ہونے کا بڑا اچھا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اس ملت کو نسلی اور لسانی نعروں سے جتنا نقصان پہنچا ہے، اتنا شاید ہی کسی اور چیز سے پہنچا ہو۔ اسی طرح ابتدائی دور میں، کوفہ اور بصرہ میں عرب قبائل کے درمیان ہونے والی کش مکش اور پھر اس سے فائدہ اٹھا کر عباسی حکومت کا قیام اور عباسی حکومت میں عرب و عجم کے اختلافات، یہ بھی ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔

پاکستان میں قومیت کا نعرہ پختون کے نام سے ہو یا بلوچ کے نام سے، بنگالی کے نام پر ہو یا مہاجر کے نام پر، کنفیڈریشن کے نام پر ہو یا پانچ قومیت کا نعرہ ہو، یا ایک قومیت کا، یہ سب گہری جڑیں رکھتے ہیں۔ جو لوگ اس ملک اور معاشرے کو، اسلام کی راہ پر لے کر جانا چاہتے ہیں، اُن کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلے کو سمجھیں اور اس کا حل نکالیں۔ اس مسئلے سے فکری اور نظریاتی بحثیں بھی متعلق ہیں، اور کچھ اس کے عملی حدود دار بعہ ہیں۔

اس مسئلے کا حل ایک حد تک فکر کی درستی میں پایا جاتا ہے، اور ایک حد تک سیاست اور عمل کی دنیا کے اندر بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں سیاست اور عمل کی دنیا میں اس مسئلے کا حل پیش کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس مسئلے کے حوالے سے چند فکری بنیادیں فراہم کرنا ہے۔ اس مسئلے پر تحریک اسلامی کو سوچنا ہوگا، یہ اس ملک کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

قومیت اور قوم پرستی کا فرق

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ قومیت اور قوم پرستی میں بڑا فرق ہے۔ قومیت ایک فطری حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ زبان، رنگ، وطن، یہ ساری وہ چیزیں ہیں جو دنیا کے اندر ایک حقیقت کے طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ انسانوں کے درمیان رابطے اور اشتراک کا کام بھی کرتی ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد پر انسان ایک دوسرے کے

ساتھ اپنے آپ کو مربوط محسوس کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک اجتماعی قوت بنتے ہیں۔

اسلام جس طرح تمام فطری حقیقتوں کو تسلیم کرتا ہے اور اپنے نظام میں ان کو ایک مناسب جگہ بھی دیتا ہے خواہ وہ خاندان ہو یا مرد اور عورت کا مقام، ریاست کا نظام ہو یا انسان کی اپنی فطرت کی کمزوریاں، انسانی خواہشات ہوں یا جذبات، وہ اُن میں سے کسی کو کچل کر، یا کسی کا استحصال کر کے زندگی کا نقشہ نہیں بناتا، بلکہ ان کو تسلیم کر کے، ان کو صحیح رخ پر ڈال کر اور زندگی میں اُن کا درست مقام متعین کر کے، فرد اور معاشرے کی زندگی کا نقشہ بناتا ہے۔ اسی طرح قومیت اور قوم پرستی کا بھی مقام متعین کرتا ہے۔

اس کے برعکس قوم پرستی کسی طبعی یا فطری حقیقت کی بجائے ایک عقیدے، دین اور مذہب کا نام ہے۔ یہ انسان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے۔ چونکہ یہ ایک مذہب اور عقیدہ ہے، اس لیے یہ اُس اسلام کی عین ضد ہے جو صرف خدا پرستی کے عقیدے اور خدا پرستی کے دین اور مذہب کو وجود میں لاتا ہے۔ اس لیے قومیت اور قوم پرستی کے فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

قومیت: اسلام، قومیت کو تسلیم بھی کرتا ہے، اور اپنے نظامِ فکر کے اندر اس کو جائز مقام بھی دیتا ہے۔ اس کے بارے قرآن و احادیث نبوی ﷺ کے اندر بے شمار شہادتیں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

> یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط (الحجرات ۴۹:۱۳)
>
> لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

جس طرح کہ پہاڑ کالے بھی ہوتے ہیں، اور لال بھی اور خاکی بھی، اور اُن میں ہر طرح کے رنگ پائے جاتے ہیں، نیز درختوں میں ہر قسم کے رنگ اور پھل پائے جاتے ہیں، اسی طرح انسان کے درمیان بھی رنگوں کا اختلاف ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بھی ہیں۔ زبانوں کے اختلاف بھی ہیں اور رنگ و نسل کا فرق بھی۔ یہ سارے کے سارے اختلاف اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ قرآن مجید ان کا ذکر کسی لعنت یا مصیبت کے طور پر نہیں کرتا، بلکہ اپنی نعمت اور رحمت کے طور پر کرتا ہے، اور ان کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی شمار کرتا ہے۔

خود قرآن مجید نے اپنے عربی ہونے کا اظہار بارہا کیا ہے کہ یہ عربی مبین میں نازل کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے بے شمار ایسے اقوال منقول ہیں جن میں آپ ﷺ نے اپنے عربی اور ہاشمی ہونے کا ذکر کیا ہے۔ غزوۂ حنین میں جب مسلمان شکست کھا رہے تھے، تو اُس وقت جو اشعار آپ ﷺ کی زبان پر تھے، اُن میں ان ساری چیزوں کا ذکر موجود تھا۔ ان میں سے کسی چیز کا ذکر کرنا، کسی چیز سے تعلق کو بیان کرنا، دینِ اسلام کی تعلیم کے خلاف نہ اُس وقت تھا نہ اب ہے اور نہ اُس کو کبھی ہونا چاہیے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب مسلمان جگہ جگہ ممالک فتح کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کا خاص طور پر خیال کیا کہ جہاں جہاں مسلمان جائیں، وہاں دینِ حق تو پھیلے، لیکن مفتوح اقوام، فاتح قوم کے تمدن اور زبان اور ثقافت کے تحت محکوم اور مغلوب ہو کر نہ رہ جائیں، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے عربوں کو غیر عربوں کا لباس اور غیر عربوں کو عربوں کا لباس پہننے سے منع فرمایا۔

عربی زبان قرآن کی زبان تھی، زندۂ جاوید زبان تھی، طاقت ور زبان تھی، لیکن جہاں دوسری زبانیں موجود تھیں وہ قائم رہیں، مثلاً فارسی۔ ہندستان میں مسلمان آئے تو دوسری زبانوں کے اشتراک سے ایک بالکل نئی زبان وجود میں آئی جو اپنے محاورے، مزاج، استعاروں، تشبیہات، ہر لحاظ سے مسلمانوں کی زبان تھی، یعنی اُردو۔ اگر مسلمانوں کی طرزِ بود و باش کو دیکھا

جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ان میں سے کسی چیز کو مٹایا اور ختم نہیں کیا، بلکہ ان سب پر غالب آ کر خدا پرستی کے رنگ میں ان سب کو رنگ دیا۔

قوم پرستی: دوسری طرف اگر قوم پرستی پر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ وہ اس کی بالکل ضد ہے۔ قوم پرستی نام ہے اس چیز کا کہ ان ساری طبعی اور مادی بنیادوں میں سے کسی ایک بنیاد کو نہ صرف یہ کہ رشتۂ اشتراک تسلیم کیا جائے، بلکہ اُس کے ساتھ انسان کی وفاداری، محبت، اطاعت اور اُس کے لیے سرفروشی کا جذبہ، سب سے زیادہ غالب ہو۔ اب یہ بات بالکل صاف اور ظاہر ہے کہ محبت اور وفاداری، سرفروشی اور جاں نثاری کے جذبے مادی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ فطرت نے پیدا کر کے خود بخود کسی کے ساتھ وابستہ نہیں کیے ہیں۔ ان کی جڑیں انسان کے دل و دماغ کے اندر موجود ہیں۔ یہ اُس کے اپنے ارادے اور اختیار پر ہے کہ وہ ان کو کسی پتھر کے ٹکڑے سے وابستہ کرتا ہے، یا کسی درخت کے ساتھ، چاند اور تاروں کے ساتھ وابستہ کرتا ہے یا اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ، یا اس کو نسل اور زبان اور جغرافیے کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے۔ یہ ہر انسان کا اپنا فعل ہے۔ وہ اپنی وفاداری کو، اپنی محبت کو اور اپنی سرفروشی و جاں نثاری کے جذبے کو، اور اپنی اطاعت کے تعلق کو جس تعلق پر بھی غالب کر دے گا وہی دراصل اُس کا بت اور خدا بن جائے گا، خواہ اُس کا بت پتھر کا ٹکڑا ہو، یا کوئی درخت، چاند سورج ہوں یا ملک اور وطن ہوں یا رنگ، نسل اور زبان۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اپنی جگہ پر خدائی کی مدعی نہیں ہے، بلکہ انسان خود ان کو خدا بناتا ہے۔ یہ اُس کا اپنا فعل ہے اور اپنے ذہن کی اختراع ہے۔

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ (النجم ۵۳:۲۳)

دراصل یہ کچھ نہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔

جب انسان مادی اور طبعی حقیقت سے بڑھ کر، اپنی وفاداری، محبت اور پرستش کو ان چیزوں کے ساتھ وابستہ کرلے گا، تو ان میں سے ہر چیز خدا بن جائے گی۔ پھر یہ کسی طبعی حقیقت کا نام نہیں ہوگا، بلکہ یہ اپنی جگہ پر ایک عقیدے اور دین اور مذہب کا نام بن جائے گا۔ ان میں

سے کوئی چیز بھی فی نفسہ اس چیز کی طالب نہیں ہے کہ اُس کی پرستش کی جائے اور اس کے ساتھ وفاداری اور محبت کو، ہر وفاداری اور ہر محبت پر غالب کیا جائے۔ جس طرح کوئی پتھر یا کوئی درخت اور چاند یہ نہیں کہتا کہ مجھے اپنا معبود بناؤ، اسی طرح کوئی وطن اور کوئی قوم، کوئی نسل اور کوئی رنگ خود اس کے دعوے دار نہیں ہیں اور نہ اس کے مستحق ہیں۔ جس طرح ایک پتھر اس بات کا مستحق نہیں ہے، اس طریقے سے رنگ و نسل اور زبان بھی اس کے مستحق نہیں ہیں کہ اُن کو خدا کے مقام پر لا کر بٹھایا جائے۔

اسلام اور قومیت کے درمیان یہ بنیادی فرق ہے، اور اس بنیادی فرق کو سمجھے بغیر ہم اس مسئلے کا حل نہیں تلاش کر سکتے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم کی تعریف کیا ہے؟

قوم کی تعریف

قوم کی تعریف کرنا بالکل اُسی طریقے سے ممکن نہیں ہے، جس طرح کوئی آدمی کہے کہ بت کی تعریف کیا ہے۔ اس لیے کہ پتھر بھی بت ہوسکتا ہے، اور انسان بھی، سورج اور چاند بھی بت بن سکتے ہیں اور نسل، رنگ اور زبان بھی۔ جس چیز کو بھی آدمی چاہے، بت بنا سکتا ہے۔ اس طریقے سے قوم کی کوئی حتمی تعریف ممکن نہیں ہے۔

قوم دراصل انسانوں کے اس احساس کا اظہار ہے کہ ہم بہت سارے انسانوں کے درمیان کوئی ایسی چیز مشترک پائی جاتی ہے جو ہماری وحدت کی بنیاد بھی بن سکتی ہے، اور ہماری پرستش کا مرکز بھی۔ یہ چیز کوئی بھی ہوسکتی ہے۔ یہ رنگ بھی ہوسکتا ہے اور نسل بھی، یہ جغرافیہ بھی ہوسکتا ہے اور زبان بھی۔ یہ تاریخ کا ایسا سرمایہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس کے ساتھ وابستگی مشترک ہو۔ ان بنیادوں پر تشکیل پانے والی قوموں کی مثالیں آج بھی دنیا کے اندر جگہ جگہ نظر آئیں گی۔

امریکی قوم کی مثال لے لیجیے۔ اُس کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ مختلف نسلوں، مختلف رنگوں اور مختلف زبانیں بولنے والے افراد وہاں آ کر آباد ہو گئے ہیں اور صرف اس بنیاد

پر اس قوم کے فرد اور اس ملک کے شہری تسلیم کیے جاتے ہیں، کہ وہ اس کی جغرافیائی حدود کے اندر رہتے ہیں، یا وہاں پر پیدا ہوگئے ہیں۔ اگر کوئی بچہ ہوائی جہاز کے گزرتے ہوئے بھی امریکی سرزمین پر پیدا ہو جائے، تو وہ امریکی قوم کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح سے اگر کوئی جرمن ہو یا ڈچ، پاکستانی ہو یا ہندستانی یا چینی، اگر وہ امریکا آ کر رہنے لگے اور انگریزی بولنا سیکھ جائے، تو وہ امریکا کا شہری بن سکتا ہے۔ گویا کوئی ایک چیز ایسی نہیں ہے کہ جس کے بارے میں مسلّمہ طور پر کہا جا سکے کہ محض زبان، رنگ، نسل یا جغرافیہ، ان میں سے کوئی ایک چیز ہے جو قوموں کو تشکیل دیتی ہو۔

اگر غور کیا جائے تو قومیت کی اصل جڑ، جس سے قوم پرستی پیدا ہوتی ہے، وہ فطری، طبعی اور مادی نہیں ہے، بلکہ دراصل انسان کے احساس، خیال اور عقیدے میں ہے۔ جب انسانوں کے اندر یہ خیال پیدا ہو جائے کہ یہ چیز ہماری پرستش کی مستحق ہے اور اس کی بنیاد پر ہم سب مل کر ایک ہیں، تو خواہ وہ کوئی چیز کچھ بھی ہو، قومیت کی بنیاد بن سکتی ہے۔

اس کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو فطری اور طبعی حقیقتیں تھیں، یعنی نسل، رنگ، زبان اور جغرافیہ کے اختلافات، وہ بالآخر قوم پرستی کی دنیا میں آ کر معبود اور الٰہ کیسے بن گئیں، اور قوم پرستی کا یہ دین اور مذہب کس طرح وجود میں آیا؟

بظاہر بات تاریخ کی ہے، لیکن میں سادہ الفاظ میں اس بات کو سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ جس فتنے سے ہمیں سابقہ درپیش ہے، یہ کیوں پیدا ہوا، اور کس طرح وجود میں آیا؟

تاریخی پس منظر

ڈیڑھ سو سال پہلے قوم پرستی نام کی کوئی چیز دنیا میں موجود نہ تھی۔ قومی عصبیتیں بڑے محدود پیمانے پر ساری دنیا میں ہمیشہ رہی ہیں، لیکن قوم پرستی کا ایسا دین کہ مخصوص زبان بولنے والے، اور مخصوص رنگ و نسل والے اس بات کے حق دار ہیں کہ اپنے سارے وسائل، سارے ذرائع اور

سارے ملک کے خود مالک ہوں، خواہ وہ مختصر سا خطہ ہو یا کوئی بہت بڑا ملک۔ یہ تصور دورِ جدید کی پیداوار ہے اور مغرب کی الحادی تہذیب نے جو زہریلے پھل اور تحفے انسان کو دیے ہیں، اُن میں سے یہ شاید سب سے بدترین اور زہریلا پھل ہے، جو اس نے انسان کے دامن میں ڈالا ہے۔

اس کا تاریخی پس منظر مغرب کی تاریخ ہی سے سامنے آتا ہے۔ مغرب کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیں اور اگر دو ہزار سال کا عرصہ سامنے ہو، سیدنا مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے جس کا شمار ہوتا ہے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ چند سو سال پہلے یورپ میں ایک ایسی حکومت تھی جو نسل اور رنگ کی بنیاد پر نہ تھی، بلکہ ایک شہنشاہیت تھی۔ اس شہنشاہیت کا نام تھا رومن شہنشاہیت، اور یورپ کے سارے ممالک اٹلی سے لے کر انگلستان تک اسی کے تحت تھے۔ ایک بادشاہ تھا اور اُس نے ایک حکومت کے تحت مختلف زبانیں بولنے والے وحشی قبائل کو ایک ریاست کے رشتے میں منسلک کر رکھا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب عیسائیت نے یورپ میں قدم رکھا تھا، اور ۳۰۰ برس کے بعد رومن شہنشاہ عیسائی ہو گئے۔ اس کے بعد روم میں عیسائیوں کا سب سے بڑا مذہبی رہنما پوپ، نہ صرف مذہبی پیشوا بن کر نمودار ہوا بلکہ پورے یورپ نے سیاسی طور پر بھی اُس کی بالادستی قبول کر لی۔

آج ہم کہتے ہیں کہ دین اور سیاست کی یک جائی اسلام کا ورثہ ہے لیکن یہ دراصل دین کا ورثہ ہے۔ چوں کہ عیسائیت کی جڑیں بھی ایک الہامی دین کے اندر تھیں، اس لیے یہ بات لازمی اور ناگزیر تھی کہ عیسائیت کا جو بھی نظام بنے اُس میں مذہب کو حکومت اور سیاست پر فوقیت حاصل ہو۔ لہٰذا یورپ کے، سب کے سب بادشاہ پوپ کی اطاعت کرتے تھے، اُس کے باج گزار اور فرماں بردار تھے۔ ان میں سے کوئی بادشاہ اگر کوئی ایسا کام کر بیٹھتا تھا جو پوپ کی مرضی اور خواہشات کے خلاف ہوتا، یا اُس کے قوانین کے خلاف ہوتا تو بادشاہ کو توبہ کرنا پڑتی تھی، کفارہ دینا پڑتا تھا۔ یہ دور چودہ پندرہ سو سال پر محیط ہے۔ چودھویں صدی عیسوی تک مغرب میں یہی کیفیت رہی۔ اب بادشاہوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ ہم روم میں بیٹھے ایک پوپ کے

مطیع کیوں بنے رہیں، کسی طرح اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ اس کے دو راستے ہو سکتے تھے: ایک مذہب کا راستہ اور دوسرا سیاست کا راستہ۔

مذہب کا کردار

مذہب کے راستے سب سے پہلے یہ بات کہی گئی کہ عیسائیت کی تعبیر کا اختیار پوپ کے پاس نہیں، بلکہ ہر عیسائی کو حاصل ہے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ عیسائیت کو سمجھنے اور اس کی تعبیر جاننے، اور یہ جاننے کے لیے کہ عیسائیت کا منشا کیا ہے، آدمی پوپ کے پاس جائے۔ اس لیے کہ بائبل ہر ایک کے پاس موجود ہے، وہ اس کو پڑھ سکتا ہے اور یہ جان سکتا ہے کہ خدا کی مرضی کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ خود ہی یہ طے کر سکتا ہے کہ وہ کیسی زندگی گزارے، جو خدا کی منشا پوری کر سکے۔ اس کو ریفارمیشن یا اصلاح کی تحریک کہتے ہیں۔ اس کے ذریعے پوپ کی مذہبی بالادستی ٹوٹ گئی، اور اُس کی یورپ کے عوام اور حکومتوں پر جو بندشیں تھیں، وہ ڈھیلی پڑ گئیں۔

دوسری بات بادشاہوں نے مختلف ذرائع سے یہ کہی تھی کہ حکومت کرنے کا حق عوام کے پاس ہے، اور عوام کو حق حاصل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر ملک کے عوام اس بات کے مستحق ہیں کہ ملک کے لیے قانون بنائیں اور اس پر حکومت کریں۔ اس طرح عوام کے نام پر فی الواقع حاکمیت کا اختیار بادشاہوں کے پاس منتقل ہو گیا۔

اس طرح دو تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ایک طرف مذہبی ریاست جو اٹلی سے انگلستان تک پھیلی ہوئی تھی، کی بالادستی ختم ہو گئی۔ اُس کی جگہ چھوٹی چھوٹی قومی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ ۱۸ویں صدی تک، یہ تمام ریاستیں اپنے اپنے مقام پر کھڑی ہو گئیں۔

ریاست کا کردار

ابتدا میں ایسا تھا کہ قوم نہ رنگ کا نام تھا، نہ نسل اور جغرافیے کا، بلکہ قوم بادشاہ کا نام تھا۔

قوم اور افراد کی وابستگی بادشاہ کے نام پر ہوا کرتی تھی۔ ان کی وفاداری بادشاہ کے لیے تھی۔ جنگیں بادشاہوں کے نام پر لڑی جاتی تھیں۔ سپہ سالار اور سپاہی بادشاہ کے ساتھ وفاداری کا حلف اُٹھاتے تھے اور بادشاہ ہی دراصل قوم کا نمایندہ ہوتا تھا۔ بادشاہوں نے یہ سارا کھیل اسی لیے کھیلا تھا کہ ان کی حکومت قائم ہو۔ اس طریقے سے پورے ۳۰۰ برس تک قوم نہ جغرافیے کا نام تھی، نہ نسل اور نہ رنگ کا، بلکہ ایک ہی بادشاہ کی حکومت میں مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف نسل اور رنگ کے لوگ ایک ہی قوم شمار ہوتے تھے۔

جب بادشاہوں کی باہمی لڑائیاں بڑھتی چلی گئیں تو بالآخر یہ فلسفہ سامنے آیا کہ دراصل قوم بادشاہ کا نام نہیں، بلکہ قوم عوام اور جمہور کا نام ہے۔ قوم کو بنانے والی چیز دراصل کوئی ایسی مشترک چیز ہے جو بادشاہ کی طرح محسوس اور سامنے نہ ہو بلکہ زبان، رنگ اور نسل کی طرح جس کی بنیاد پر انسان منظّم اور مجتمع ہوکر ایک جگہ ہو جائیں۔ چنانچہ حاکمیت اب قوم کے پاس جا کر ٹھیری۔ عوام کی حاکمیت اُس کے ساتھ ساتھ آئی۔ اس نے بادشاہوں کے اختیارات بھی کم کردیے، اگرچہ بادشاہوں کے ساتھ وابستگی ختم نہیں ہوئی۔

آج بھی جہاں ایک بادشاہ اور ملکہ موجود ہیں، دیکھا جا سکتا ہے کہ عوام کس طرح ان شہزادوں اور شہزادیوں کی شادیوں اور مراسم سے دل چسپی رکھتے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں انسان سڑکوں پر جمع ہوتے ہیں، ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اب بھی جہاں بادشاہ موجود ہیں، وہ قوم کی وحدانیت و یگانگت کی علامت کے طور پر کام کر رہے ہیں، لیکن فی الواقع سیاسی اور مذہبی طور پر پرستش اور اطاعت کا مرکز، پوپ اور خدا سے منتقل ہوکر قوم اور وطن کو حاصل ہوگیا۔ یہی دراصل قوم پرستی کا دین ہے۔

ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کی زندگی اور اُس کی فطرت میں، پرستش کا ایک خزانہ ہے جو اس کی پوری زندگی پر محیط ہے، اور یہ اتنا فطری جذبہ ہے کہ اسے کبھی بھی مٹایا، دبایا، یا ختم نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کی زندگی میں اگر رنگ بھرا جاسکتا ہے

تو پرستش سے، اُس کے جذبات اگر اُمنڈتے ہیں تو پرستش سے، اگر وہ کسی کے کچھ کام آتا ہے تو کسی کی پرستش اور عبودیت کی بنا پر، اگر اُس کی زندگی کے اندر صلاحیت اور استعداد پیدا ہوتی ہے تو پرستش، والہانہ وابستگی اور عبودیت سے ہوتی ہے۔ یہ معبود درہم و دینار ہو یا پیسہ، کیریئر اور آئیڈیل ہو یا جایداد، ولی اور پیر ہو یا کوئی رہنما رنگ و نسل ہو یا ملک اور وطن، لیکن جب تک انسان کسی کو اپنا معبود نہیں بنائے گا، اُس کی خاطر ہر چیز کو قربان نہیں کرے گا، اُس کی محبت کو ہر محبت پر ترجیح نہیں دے گا، اُس کی خاطر اپنی زندگی وقف نہیں کرے گا، وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

وطن پرستی

جب یورپ سے خدا کی پرستش کا خانہ خالی ہو گیا تو بالآخر کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جو پرستش کا مرکز بن سکے، اور وہ چیز قوم اور وطن کی شکل میں نمودار ہوئی۔ علامہ اقبال نے اس تاریخی مشاہدے، تجربے اور اظہار کو اس شعر کے اندر بیان کیا ہے ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اُس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

گویا جب یہ تازہ خدا وطن کے نام سے تراشا گیا، اُس کی صناعی ہوئی اور جب درخت، پتھر، چاند اور سورج کے بجائے، ملک اور وطن معبود بن بیٹھا تو پھر وطن کا یہ خدا مذہب کے ساتھ یک جا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا پیرہن مذہب کا کفن ہے۔ جہاں وطن پرستی اور قوم پرستی کا مذہب آئے گا، وہاں پر خدا پرستی کا مذہب نہیں ٹھیر سکتا۔

یہ وہ حقیقت ہے جو یورپ کی تاریخ سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کے بعد یورپ میں جو الحادی تہذیب و سیاست پروان چڑھی، جس الحادی سائنس نے نشو و نما پائی، جو الحادی فکر پیدا ہوئی، اس سب کا مرکز قوم پرستی کا یہ مذہب تھا، جس نے یورپ میں سب سے زیادہ غالب

حیثیت اختیار کی۔ پھر قوم پرستی نے صرف یورپ میں ہی غالب حیثیت نہیں حاصل کی بلکہ جب یورپ کا سیاسی غلبہ پوری دنیا کے میں پھیلا، اور اسے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سیاسی تسلط حاصل ہوا، تو قوم پرستی بھی پھیلتی چلی گئی۔ مُلّا تو فساد اور فتنے کے لیے بدنام ہے، حقیقت یہ ہے کہ قوم پرستی کے مذہب نے دنیا کے اندر جو فساد اور فتنہ پیدا کیا ہے اور انسان کا جو خون بہایا ہے اُس کی کوئی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ پہلی جنگ عظیم اس قوم پرستی کے مذہب کا ایک چھوٹا سا تحفہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا اور پیغمبر اسلام ﷺ نے جنگیں لڑ کر لوگوں کو مسلمان کیا اور بے شمار لوگ مسلمان ہوتے گئے۔ لیکن اگر ان ساری جنگوں کے جانی نقصان کا اندازہ لگایا جائے جو اسلام کے دور میں لڑی گئیں تو وہ چند سو نفوس پر مشتمل ہوگا۔ جب کہ پہلی جنگ عظیم میں ۸۰ لاکھ انسان قتل ہوئے اور تقریباً اڑھائی کروڑ انسان معذور ہوئے جن کی آنکھیں، کان اور ہاتھ پاؤں ضائع ہو گئے۔ یہ صرف ایک جنگ کا ورثہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر انسان نے وہ بم ایجاد کیا جس نے ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایک سیکنڈ میں ڈیڑھ لاکھ انسانوں کو نیست و نابود کر دیا۔ وہ بھاپ اور بخارات بن کر اُڑ گئے۔ اس طرح تقریباً ۸۰ لاکھ انسانوں کی ہلاکت پہلی جنگ عظیم میں ہوئی، اور تقریباً ۳ کروڑ انسان دوسری جنگ عظیم میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ آبادیوں کی آبادیاں ختم ہوگئیں۔ شہروں پر اس طریقے سے بم برسائے گئے کہ لاکھوں انسان اس بم باری کا شکار ہو گئے۔ ساری خوں ریزی دراصل اس قوم پرستی کے شجرِ مذہب کا زہریلا پھل تھا جو سامنے آیا۔ ہم نے کراچی اور بنگلہ دیش میں اس کے جو مظاہر دیکھے ہیں، وہ تو کچھ بھی نہیں، اس کے مقابلے میں جس سے سابقہ خود یورپ کو اس مذہب کی بنیاد پر پیش آیا۔ جس کو اُس نے خود پروان چڑھایا اور رائج کیا۔

اگر غور کریں تو قوم پرستی سے بڑی کوئی اور لعنت انسان کے لیے نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ یہ نظریہ انسان کو ایسی فصیلوں اور خلیجوں میں تقسیم کر دیتا ہے جن کو انسان کبھی عبور نہیں کر سکتا۔

انسانوں کے درمیان صلاحیت، مزاج اور خوبیوں خامیوں کا فرق ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ انسانوں کو مختلف گروہوں کے اندر بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن مجید انسانوں کو صرف دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے: ایک گروہ اہل ایمان اور عملِ صالح والوں کا اور دوسرا وہ جو ایمان اور عملِ صالح کی نعمت سے محروم ہو کر مخالف سمت میں چلتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مذہب لوگوں کو بانٹتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مذہب انسانوں کو عقیدے اور ایمان کی بنیاد پر بانٹتا ہے لیکن عقیدے کی یہ بنیاد انسان کے لیے رنگ اور نسل کی طرح ناقابلِ عبور نہیں ہے۔ انسان اپنا عقیدہ بدل کر ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں، اور ایک قوم سے دوسری قوم میں شامل ہو سکتا ہے۔ ایمان اور عمل انسان کے اپنے اختیار اور ارادے کی چیز ہے۔ ایمان اور عمل دراصل انسان کے اس شرف اور عزت کو ظاہر کرتا ہے کہ انسان جب چاہے اپنے ایمان اور عمل کو تبدیل کر کے ایک قوم سے دوسری قوم میں شامل ہو سکتا ہے۔

مغرب کے فلسفے کے نتائج

مغرب کے قوم پرستی کے فلسفے نے انسان کو جس بنیاد پر تقسیم کیا ہے وہ بنیادیں انسان کے لیے ناقابلِ عبور ہیں۔ اگر کوئی آدمی کالا ہو اور ساری عمر بھی سر مارے تو سفید نہیں ہو سکتا، اور کوئی گورا آدمی اپنی ساری قوتیں بھی لگا دے تو کالے رنگ کا نہیں بن سکتا۔ رنگ کی تقسیم دراصل ایسی تقسیم ہے جو انسان کے اپنے بس اور اختیار میں نہیں ہے۔ وہ اس کو کبھی نہیں مٹا سکتا۔ نسل اور جغرافیے کی تقسیم بھی اسی طرح کی تقسیم ہے۔ گویا قوم پرستی کا مذہب انسان کو اس طرح بانٹ دیتا ہے کہ وحدت انسانی کا تصور ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ انسان ایک دوسرے سے اس طرح کٹ جاتے ہیں کہ وہ آپس میں نفرت کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ کبھی ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

یورپ کا مذہب پر یہ اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ مذہب کے جبر کے اندر پابند کر کے انسان

کو قید کر دیتا ہے۔ لیکن قوم پرستی کے مذہب سے بڑھ کر جبریت کسی اور مذہب میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ قوم پرستی کا مذہب انسان کو اس طرح مجبور کرتا ہے کہ نہ اپنے اختیار سے وہ کہیں پیدا ہوا ہے، نہ اپنے اختیار سے اس نے اپنا رنگ بنایا ہے، نہ اپنے اختیار سے اس نے اپنی زبان اختیار کی ہے، لیکن وہ مجبور ہے کہ اُس کا جو رنگ ہے جس کے ساتھ وہ پیدا ہوا ہے، اُس کی زبان جو اُس کی ماں سے اُس کو ملی ہے، اُس کی نسل جو اُس کے ماں باپ سے اُس کو منتقل ہوئی ہے، ہمیشہ کے لیے اس کا اسیر اور غلام رہے۔ اُس کی شناخت اور پہچان ہمیشہ وہی رہے کہ جس کے ساتھ وہ پیدا ہوا ہے۔

قوم پرستی کا مذہب ایک آدمی کی اپنی شخصیت اور ارادے و اختیار کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس سے پہلے وفاداری کے مستحق وہ بادشاہ یا پجاری ہوا کرتے تھے، جو انسان کو دکھائی دیتے تھے۔ اگر بادشاہ غلطی کرتا تو انسان اس کو پکڑ سکتا تھا، اُس کو تخت سے اُتارا جا سکتا تھا۔ بادشاہ مر بھی جاتے تھے، ہمیشہ زندہ نہیں رہا کرتے تھے، لازوال نہیں تھے، بلکہ ایک بادشاہ مرتا تھا تو دوسرا اُس کی جگہ لے لیتا تھا۔ اسی طریقے سے پتھر ہوں یا درخت، جتنے بھی معبود ہیں، یہ سارے کے سارے انسان کے اپنے بنائے ہوئے ہوتے تھے۔ لیکن ان میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی کہ آدمی دیکھ سکے کہ یہ قوم ہے اور مجھے اس کی اطاعت کرنی ہے۔

بادشاہ مر جاتے ہیں، پجاری مر جاتے ہیں، معبود مر جاتے ہیں، پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں، سورج ڈوب جاتا ہے، چاند ڈوب جاتا ہے، لیکن ان کے برعکس قوم ایک ایسا معبود بن کر نمودار ہوئی ہے جس کو کبھی زوال نہیں ہے۔ قوم اس طرح زندہ ہے کہ لوگوں کی نظروں کے سامنے ہے۔ ظاہر ہے کہ قوم کے نام پر افراد کی ساری آزادیاں ختم ہو گئی ہیں۔ وہ غلاموں کی طرح حکومتوں اور ریاستوں کے پابند ہو گئے ہیں۔ ریاست جو قانون بنا لے سارے انسان اس کے پابند ہیں۔ اس کو وہ تقدس حاصل ہے، جو اس سے پہلے بادشاہ کو بھی حاصل نہیں تھا۔ بادشاہ کے سامنے کوئی کہہ سکتا تھا کہ تم ظالم اور جابر ہو، کلمۂ حق بلند کر سکتا تھا،

لیکن پوری کی پوری قوم کیسے ظالم اور جابر ہو جائے گی۔ وزیراعظم یا صدر تو ظالم و جابر ہو سکتا ہے، انھیں تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے، تاہم ان کے مقابلے میں اصل معبود قوم ہے، اور اس کی حیثیت مستقل ہے۔ اُس کے نام پر انسانوں کو کارخانوں میں داخل کیا جا سکتا ہے، جایدادیں ضبط کی جا سکتی ہیں، جنگلوں میں جھونکا جا سکتا ہے۔ اس صدی میں قوم کے نام پر انسانوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا گیا، اور انسان نے اس کو خاموشی کے ساتھ برداشت کیا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھیں تو قوم پرستی کے مذہب نے انسان کی انفرادی شخصیت اور اُس کی انفرادی آزادی کو بالکل ختم کر کے رکھ دیا ہے۔

اس سے اگلی چیز یہ ہے کہ یہ انسان کو ان چیزوں پر جوڑتی اور جمع کرتی ہے جو مادی اور حسّی ہیں۔ گویا انسان کو انسانیت کے مقام سے گرا کر جانور کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ اس لیے کہ اتحاد اور اجتماع کی بنیاد دل و دماغ، عقیدہ اور خیال ہو، اور ایمان اور عمل ہو، تو یہ چیزیں اعلیٰ وارفع ہیں۔ لیکن اگر اس کی بنیاد رنگ، نسل، زبان اور خاندان ہو تو اس کے معنی ہیں کہ انسان کی وحدت کی بنیاد کو انتہائی حقیر سطح پر گرا دیا گیا ہے۔

انسان دوسرے انسان سے اس لیے ملے گا کہ ہمارا ایمان اور ہمارا اخلاق ایک ہی منزل کا متلاشی ہے۔ ہماری فکر ایک ہے کہ ہم ایک انداز میں سوچتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ ہمارا رنگ ایک ہے یا ہماری نسل ایک ہے، جو ہمارے ماں باپ سے ہم تک منتقل ہوئی ہے، ہماری زبان ایک ہے جو ہم نے اپنے ماں باپ کے گھر سیکھی ہے، ہمارا جغرافیہ ایک ہے جہاں ہم اپنے ارادے کے خلاف پیدا ہو گئے ہیں۔

یہی بات علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے یوں کہی ہے کہ: اسلام کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُس نے انسانیت کے اتحاد اور اجتماع کے لیے وہ بنیادیں فراہم کیں جو زمین کے اندر نہیں بلکہ آسمان پر ہیں۔ وہ خدا پر ایمان، اس کے اُوپر یقین ہے اور اسی نے انسان کو مجتمع کیا۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر سارے کے سارے انسان خواہ اُن کا کوئی بھی رنگ، نسل یا زبان ہو، مجتمع

ہو کر ایک وحدت بن سکتے ہیں۔

اسلام کا تصورِ قومیت

اسلام قومیت کے اُس تصور، مزاج، فکر اور عقیدے کے خلاف ہے جسے مغرب نے اس کی بنیاد بنایا ہے۔ اس لیے کہ خدا پرستی کے ساتھ ان میں سے کوئی پرستی نہیں چل سکتی۔ اسلام نے اس پورے کے پورے فتنے کا استیصال کیا ہے، اور بار بار یہ بات کہی کہ دراصل عصبیت سارے فتنوں کی جڑ ہے۔

سب سے پہلے قصہ تخلیق آدم دیکھیے، جس کا قرآن مجید نے بار بار ذکر کیا ہے۔ ابلیس کو آخر کیا چیز لے ڈوبی؟ اگر اس کے الفاظ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ نسل وہ چیز تھی جو اُس کو لے ڈوبی۔ اس نے کہا تھا کہ:

قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ (اعراف ۷:۱۲)

یعنی میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔ لہٰذا میں معزز ہوں اور یہ ذلیل ہے۔ اس کو میں سجدہ کیسے کروں، اس کے آگے کیسے جھک جاؤں۔

اگر قرآن مجید کے بیان پر غور کریں کہ نسل پر فخر و غرور اور نسل کے ساتھ وابستگی اور عزت و ذلت کے لیے نسل کو معیار بنانا، یہ وہ چیز ہے جہاں سے انسان کی اس کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی قومیت کی جڑ ہے۔ قرآن نے اسی لیے بار بار کہا ہے کہ ابلیس تمھارا کھلا دشمن ہے، اور فرشتوں نے اس لیے کہا تھا کہ انسان اگر شیطان کی اس راہ پر نکل کھڑا ہوا تو زمین کے اندر فساد پیدا ہوگا اور خون بھی بہے گا۔ (البقرہ ۲:۳۰) اس لیے کہ جب نسلیت اور قومیت کا مذہب پروان چڑھے گا تو یہ سارے کے سارے فتنے پیدا ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ نے مختلف مواقع پر اُس عرب میں جہاں قبائلی عصبیت پر فخر اور یہ ساری

چیزیں موجود تھیں، ان کو تسلیم کرنے کے باوجود سب کو خدا پرستی کے تابع کر دیا اور انسان کو اس بات کی تعلیم دی کہ کسی عربی کو کسی عجمی اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ کسی کالے کو گورے پر کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اس لیے کہ سب آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئے ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ گویا سارے انسانوں کی آخری جڑ خواہ کوئی بھی نسل ہو، کوئی بھی قوم ہو، کوئی رنگ ہو، کہیں بھی پیدا ہوئے ہوں، اُن کا شجرۂ نسب آدم علیہ السلام سے ملتا ہے اور آدم علیہ السلام کا شجرۂ نسب اگر کہیں ملتا ہے تو مٹی سے ملتا ہے۔ پھر یہ کیوں فخر و غرور کی بنیاد ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے عصبیت کی طرف بلایا، اس کی دعوت دی، اس کے لیے لڑا، اس کے لیے خون بہائے گا، وہ ہم میں سے نہیں اور مرے گا تو جاہلیت کی موت مرے گا۔ ان میں سے کوئی چیز بھی پرستش کے لائق نہیں ہے۔ لہٰذا اسلام کی بنیادی تعلیمات، بنیادی مزاج اور قرآن مجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اس معاملے میں واضح اور صاف ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو پچھلے سو سال میں، جتنا نقصان اس قوم پرستی کے فتنے نے اسلام اور مسلمانوں کو پہنچایا ہے، اتنا کسی اور فتنے نے نہیں پہنچایا۔ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے سے لے کر آج تک اگر مسلمانوں کو کسی چیز نے سب سے بڑھ کر نقصان پہنچایا ہے تو وہ یہی قوم پرستی کا فتنہ ہے۔ اگر ہم اس نئے مذہب اور نئے دین کے مقابلے میں، اپنے دین و مذہب کو غالب نہ کریں گے تو ہم مسلسل اس نقصان کا شکار ہوتے رہیں گے۔

تین ممکنہ حل

اس ضمن میں تین بنیادی چیزوں پر غور کریں تو شاید مسائل کے حل کی راہ نکل سکے:

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قوم پرستی اور قومیت کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ قومیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی قوم پرستی کے فتنے سے بچا جا سکتا ہے۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسی بات پر لوگوں سے معاملہ کیا تھا۔ قبائل جیسے تھے، اسی طریقے سے محفوظ رکھے گئے تھے۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان اگر کوئی فرق تھا، تو اُس کو مٹا کر ختم نہیں کر دیا گیا تھا، بلکہ اس کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی بنیاد پر معاشرے کے اندر خدا پرستی کو غالب کیا گیا تھا۔ جہاد کے اندر اگر لوگ آتے تھے تو قبائلی جھنڈوں کے تحت آتے اور اسی کے تحت لڑا کرتے تھے۔ یہ ساری کی ساری چیزیں موجود ہیں، ان کا صحیح ادراک ضروری ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ ظلم جہاں بھی جس کے بھی خلاف ہو، اُس کے خلاف لڑنا اور آواز اٹھانا اسلام کا بنیادی فرض ہے۔ اسلام اور ظلم ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ گویا کہ اگر کہیں، کسی علاقے یا کسی قومیت کے حقوق پامال ہو رہے ہوں تو اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا ہوگی۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ منفی کام کبھی فائدہ نہیں دیتا۔ ایک منفی دعوت کے مقابلے میں ایک مثبت دعوت، باطل خدا کے مقابلے میں خدائے حق ہے کی دعوت کو اتنے زوردار انداز میں پیش کریں، کہ لوگ اُس کی طرف لپک کر آئیں۔

اگر ہم غور کریں تو ان تین بنیادی نکات سے اس مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔ اسلام نے قومیت اور قوم پرست کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے، رنگ، نسل اور خطے سے بالاتر ہو کر انسانیت کو مجتمع کیا ہے، اور قوم پرستی اور وطن پرستی کی جڑ کاٹ کر اس فتنے کا استیصال کیا ہے جس کے نتیجے میں دنیا میں بڑے پیمانے پر فساد اور خوں ریزی ہوئی اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس پیغام کو عام کرنے کی جتنی آج ضرورت ہے شاید کل نہ تھی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

❖❖❖